اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

نام کتاب ـــــــ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ۔ کرنے کا اصل کام

باراول تا یازدہم (مئی 1968ء تا مارچ 2001ء) ـــــــ 34800

بار دوازدہم (جنوری 2004ء) ـــــــ 1100

ناشر ـــــــ ناظم نشرو اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

مقامِ اشاعت ـــــــ 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ـــــــ شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ـــــــ 12 روپے

- فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء
- بنیادی نقطۂ نظر
- عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش
- مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل
- علومِ عمرانی کا ارتقاء
- اسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں
- تعبیر کی کوتاہی
- 'اُحیائے اسلام' کی شرطِ لازم: 'تجدیدِ ایمان'
- کرنے کا اصل کام
- عملی اقدامات

تقدیم

میری یہ تحریر، جو صفحاتِ آئندہ میں پیش کی جا رہی ہے، اولاً ماہنامہ 'میثاق' لاہور بابت جون ۶۷ء کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں مئی ۶۸ء میں اسے دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور نے ایک کتابچے کی صورت میں ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ دوسری بار یہ کتابچہ دسمبر ۷۲ء میں دو ہزار کی تعداد میں طبع ہوا۔ تیسری بار جون ۷۳ء میں چار ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ چوتھی مرتبہ جون ۸۰ء میں دو ہزار طبع ہوا۔ اور اب پانچویں بار اپریل ۸۲ء میں ساڑھے پانچ ہزار کی تعداد میں طبع ہو رہا ہے۔

اس میں، میں نے اپنے فہم کی حد تک بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت ہم بحیثیت مسلمان کس مقام پر ہیں اور یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور امتِ مسلمہ کی تعمیرِ نو کے لئے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے، فی الوقت کیا ہو رہا ہے اور کیا کرنا باقی ہے۔ ساتھ ہی اپنے تجزیئے (ANALYSIS) کی بنیاد پر میں نے ایک اساسی لائحہ عمل بھی پیش کیا تھا اور فوری اور اوّلین اقدام کے طور پر ایک "قرآن اکیڈمی" کے قیام کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

اس لائحہ عمل کو پیش کرنے کے فوراً بعد ہی بحمد اللہ، میں نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ پانچ سال کی محنت کے دوسرے بہت سے ثمرات کے ساتھ ساتھ ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ اس نہج پر باقاعدہ اجتماعی جدوجہد اور خصوصاً "قرآن اکیڈمی" کے مجوزہ خاکے کو عملی صورت دینے کے لئے ۷۲ء میں "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کا قیام عمل میں آگیا جس کی قرار دادِ تاسیس (MEMORANDUM) اور اغراض و مقاصد میں ان تجاویز کو بالکلیہ سمو لیا گیا اور اسے گویا اس کے اساسی منشور (MANIFESTO) کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

پندرہ سال کی مدّت میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں تاہم کچھ اس بنا پر کہ میرے نزدیک حالات میں بنیادی تغیّر کوئی واقع نہیں ہوا اور کچھ اس وجہ سے کہ اب اس تحریر کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے، اسے بغیر کسی ترمیم کے شائع کیا جا رہا ہے بجز اس کے کہ آخری دو صفحات کی عبارت میں کچھ اختصار کر کے مجوّزہ قرآن اکیڈمی کے ضمن میں پیش رفت کا جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔

خاکسار: اسرار احمد

صدر مؤسس انجمن خدام القرآن لاہور

اپریل ۸۲ء

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدّن کا سکہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمّنات کی اصل زمامِ کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوّتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقّتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدّن کے خلاف صف آراء ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلّیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بُنیادی نقطۂ نظر

تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دَوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پَیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ـــــــ لیکن اس پُورے ذہنی و فکری سفر کے دَوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پُورے فکر کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے 'ٹھوس' حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدم اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ 'تصوّرات' رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور کائنات، مادّہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہر حال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ـــــــ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہرِ درخشاں کی حیثیّت و وقعت ایک "ذرۂ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیّت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہرِ درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1] [2] اسی طرح حقیقتِ

---

[1] مہرِ درخشاں ذرّۂ فانی ـــــــ ذرّۂ فانی مہرِ درخشاں (دکوثر)

[2] "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں" اقبالؔ

نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دینوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب 'کائنات' اور 'مادّہ' تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سُراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ـــــــ قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادّے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئے مادّہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ـــــــ!!

عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلّح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرّۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے۔ لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دو گونہ تھا یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِّ عمل اس کے خلاف

پیدا ہوا اس میں بھی اوّلاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلّط اور قبضے اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، بارہا درد انگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنّا اور "گردشِ ایّام" کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سیّد جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیت کا روپ دھارا اور کبھی تحریکِ خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلّط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ —— یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادّی ترقّی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا نتیجتہً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیّت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جُوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا —— خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا لیکن سائنس چونکہ بالکل حتمی' اور قطعی تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات، رُوح کے بجائے مادّے اور حیاتِ اُخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی کی اہمیّت پوری امّتِ مسلمہ حتّیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے

نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل

مغربی فلسفہ و فکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دَوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین و مذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفّظ کی سعی کی۔ تحفّظ و مدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفّظ پر قناعت کی گئی۔ اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحابِ کہف کی سنّت کا اتّباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نری فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالمِ اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے، اور ہر طرح کے طعن و استہزا کو انگیز کرتے ہوتے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں اُمّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادّہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ؂ وقال الرسول؂ کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ـــــــ اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتم برصغیر میں دار العلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعۃً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ـــــــ!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ——— زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیّت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی عقلیّت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہند و مصر کے کچھ نیم متکلّم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماوراء الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمّد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیّتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقّی کی اُس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا لیکن یہ بہرحال امرِ واقعہ ہے کہ اُن کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادّہ پرستانہ ذہنیّت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لا مذہبی ایڈیشن تیّار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اُوپر سے اسلام کا لیبل اُتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیّت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطورِ 'معذرت' پیش ہو گیا۔

علومِ عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات

بعد الممات کے عدمِ اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور رُوح کے بجائے مادّہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ——— اور دوسری طرف حیاتِ اُخروی سرے سے خارج از بحث ہوگئی، اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصوّرات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالمِ واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصۂ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریّت اور جمہوریّت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرِکار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالفاظِ صحیح افراط و تفریط کے دھکوں کا اثر عالمِ اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطورِ نظامِ زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظامِ حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدّد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں۔ بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصوّرِ دین ان کی پُشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے ——— پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی

وجہ سے عالمِ اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیّت میں بحیثیتِ مجموعی کمی واقع ہوتی ہے۔

مغربی فلسفہ وفکر اور تہذیب وتمدّن سے مرعوبیّت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلّط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے[1]۔ اور اگرچہ تحفّظ وحمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون وامداد کے پردے میں معاشی تفوّق وبرتری کے بندھن ابھی باقی ہیں۔ تاہم تقریباً پُورا عالمِ اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے! دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب وتمدّن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی ٹھوس، معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیّت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ، نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیّت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ خود مادّہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوّتِ محض کی صُورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ماوراء الطبعیاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصُول کے لیے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیّت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے

---

[1] دولتِ برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصوّر کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب و عوامل سے تقویّت پاکر 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِ کار ہوئیں۔ جن میں قوّت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم ترتھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برِّصغیر پاک و ہند کی 'جماعتِ اسلامی' کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[1] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِعمل ہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہوسکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پُورا کرچکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں 'اخوان المسلمون' کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہوچکا ہے، اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برِّصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہوچکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریّت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا[2]۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقّی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آگئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصوّرِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے بیس سال قبل کی ہے۔ اب ان تحریکوں کی عمر نصف صدی سے متجاوز ہو چکی ہے۔ [2] یہ بات بھی آج سے دس سال قبل تک تھی گزشتہ دس سالوں کے دوران جماعت نے فوجی آمریت کے ساتھ 'شریفانہ سمجھوتہ' کرکے اپنی پوزیشن خراب کرلی ہے!۔

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیّتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن 'ایمان باللہ' کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثّرِ حقیقی اور مسبب الاسباب 'نظر' آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کُنْ فِی الدُّنیا کَاَنَّکَ غَرِیبٌ اَوْعَابِرُ سَبِیْلٍ"[۱] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصوّر زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں مِلّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں[۲] اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا 'ایمان' کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیّت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیّت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!

---

[۱] حدیثِ نبوی ؐ:۔ دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر!

[۲] اس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں جناب غلام احمد پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ"[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے!
زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیئے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ رُوح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ"[3] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصّوم لی وانا اجزی بہٖ"[4] اوّل تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[5]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔!
اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس

---

[1] حدیثِ نبویؐ "الصلوٰۃ معراجُ المؤمنین": نماز مومنوں کی معراج ہے! [2] حدیثِ نبویؐ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے! [3] حدیثِ نبویؐ: "روزہ ڈھال کے مانند ہے" [4] حدیثِ قدسی "روزہ میرے لیے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قرأت کے مطابق! "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔ [5] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادّیت کے پردے پڑے ہوتے ہیں!

نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجتہً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئی۔ اور مادّہ اور حیاتِ دنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاحِ انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاحِ اخروی اور فلاحِ دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دنیوی پر مرکوز ہیں لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" — (POLITICO -SOCIAL SYSTEM) بن کر رہ گیا — اور "الٰہیات" کی حیثیّت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی[۱]! چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبّت اور اس کے سامنے تضرّع و اخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیّت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی[۲]۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریّت یا

---

[۱] چنانچہ اس دَور کے ایک بہت بڑے متکلّمِ اور داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔ ع "چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است"!

[۲] یہ صورت حال بھی خاصی قدامت پسند' اسلامی تحریکوں' کے یہاں ہے — ورنہ زیادہ 'ترقی پسند' لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیر اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک 'معاشی' پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص "نظامِ ربوبیت" سے' باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو اُن کے ضمن میں جہاں سر سیّد مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنّت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا' ہے۔ مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوعِ بحث نہیں اس لیے کہ چاہے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کیے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج — تا ثریا مے رود دیوار کج!!!

اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ـــــــ گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ۔

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی ۔۔۔ کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ۔

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن ۔۔۔ غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

'احیائے اسلام کی شرطِ لازم

تجدیدِ ایمان'

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوتی ہے اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصوّر اور اس پر ایک بہتر نظام حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابلِ قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی وجہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیّت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی وجہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے !

ایمان لامحالہ کچھ ماوراء الطبعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اُن دیکھی حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سر کے کانوں سے سُنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد اُن باتوں پر کرے جو صرف دِل کے کانوں سے سُنی جاسکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پُورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیّتِ ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس رُوحِ ربّانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجودِ ملائک ہوا[1] ——— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے!! اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھّر کے پَر سے زیادہ محسوس نہ ہو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثّر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی واقعۃً پیدا نہ ہو جائے "احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربّانی و نورِ ایمانی سے منوّر، سینے کبر، حسد، بُغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ

---

[1] آیۂ قرآنی "فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ" ———
ترجمہ: جب میں اسے پُوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں۔

کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔
اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادّہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین
کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے
"دلِ روشن" "نورِ یقین" اور "نفس گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ
ایمان و یقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود
ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ یَّھْدِیَ بِکَ اللّٰہُ رَجُلًا وَّاحِدًا
خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ[1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحۂ عمل قرار دے
لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی
ہے جس کے زیرِ اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات
مادّے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیت کا احساس اجاگر
ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار
دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج
ایک تہائی صدی[2] سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی
نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلیتہً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ
ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتہً پیدا
ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں
خالقِ کائنات کی ہے اور اصل اہمیت اسباب کی نہیں مسبّب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔"

[2] اب اس تحریک کی عمر بھی نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔!

نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالےٰ سے بجھتی ہے! دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنّتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتد بہ حصّہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دَور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیّت (INTELLECTUAL MINORITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔! لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اوّلین اہمیّت حاصل ہے ——— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا۔ اور انہیں جہالت و جاہلیّت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام النّاس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اُٹھے

جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ــــــ اور انہیں مادیّت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلّل اثبات اور الحاد و مادّہ پرستی کے پُرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سَر ہونا محال ہے۔ اِساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجُودہ دَور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پُوری نوعِ انسانی ایک کنبے کی حیثیّت اختیار کر چکی ہے۔ لہٰذا علمی سطح کا تعیّن کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پُوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا ــــــ اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیّت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجُود ہو، جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجُود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصُول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اوّلاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمّل جائزہ لینا ہوگا، اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پُوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماوراء الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکرِ انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ

وحیِ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقتِ نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منوّر ہو جائیں، آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے، تو اسی کا نام ایمان ہے۔!

پھر یہی ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہوگا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہو گا جن کی شخصیتیں "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا"[۱] کی مجسم تفسیر اور ع " قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گے اس لیے کہ قرآن کا "مغز" دراصل یہی 'علم حقیقت' ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیّت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً "استخوان" کی ہے[۲]! ——— اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون و شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباس رضؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ[۳]

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدّن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو 'علم حقیقت' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب

۱۔ آیت قرآنی: "اللہ کی خشیت اس کے اہل علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔"!
۲۔ ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم ۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم (رومی)
۳۔ ترجمہ: "ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن"

ہوں جو قرآن حکیم کی آیات بیّنات کی صورت میں رواں ہیں، ان ہی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی "تہافت"[1] تصنیف کرسکیں اور آج کے منطقیّین پر از سرِ نو "رد"[2] کرسکیں، اور فی الجملہ الحاد و مادّہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا 'مثبت' کام بھی کرنا ہوگا تاکہ ریاضی، طبعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے[3] اور جو اسی حقیقتِ کلّی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہرِ اتمّ ایمان ہے، انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فِٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علّامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصّہ تو اگرچہ بہت محلِّ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علّامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علّامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ——— "ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں، زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں ......" اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمّت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع و قابلِ قدر کام ہو جاتا لیکن افسوس کہ خود علّامہ مرحوم کے حلقۂ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانیٔ طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔!

---

[1] تہافت الفلاسفہ۔ تالیف امام غزالیؒ

[2] الرّد علی المنطقیّین ۔ تالیف امام ابن تیمیہؒ

[3] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیّت حاصل ہے۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ امید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جاسکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ــــــ!

"الہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلّل و مفصّل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برِّصغیر ہند و پاک میں ہوا ہے خصوصاً جماعتِ اسلامی اور الاخوان المسلمون نے "اسلامی نظامِ حیات" اور "عدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتداء قرار دیا جاسکتا ہے اور ادھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیّت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابل قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے، دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے، آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیّت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیّت سے زیادہ کیفیّت پیشِ نظر رہے۔

اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے،

اور دوسری طرف قرآن و سنّت میں گہری مہارت لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دقّتِ نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیّت کا بندوبست کرے[1] اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیّت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ آج کے دَور میں، جبکہ مادیّت اور دنیا پرستی کا قلوب و اذہان پر مکمل تسلّط ہے اور کچھ توفی الواقع طلبِ معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں، پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی، اور اگر کچھ مخلص و صاحبِ عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو انشاء اللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک کو کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ[2] اپنا لائحہ عمل بنا کر علمِ قرآن کی تحصیل و اشاعت کے لیے زندگی وقف کر دیں ۔۔۔

---

[1] الحمد للہ کہ ان مقاصد کے لیے ۱۹۷۵ء میں "تنظیم اسلامی" کا قیام عمل میں آ گیا

[2] حدیث نبوی ؐ "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔"

یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ وخیال کے تحت انسان میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع ومشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ وارفع نصب العین کے لیے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ـــــــــ جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم وحکمت سے بھی براہِ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

علومِ قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہوگا۔ نتیجتہً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے 'متعارف' ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر وقیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم وحکمت کی تحصیل اور نشر واشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا' اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآنِ حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے، اور ساتھ ہی حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے ـــــــ پھر ان میں سے جو لوگ فلسفۂ الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے، ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید

فلسفیانہ رجحانات پر مدلّل تنقید کریں اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

پس نوشت

صفحاتِ گزشتہ میں "قرآن اکیڈمی" کا جو خاکہ سامنے آیا وہ راقم کے قلم سے جون ۱۹۶۷ء میں نکلا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بالکل اسی نظریے اور خیال کے تحت اوّلاً ۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "دارالارشاد" قائم کیا تھا۔ اور پھر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال مرحوم کی تحریک پر "دارالاسلام" کی تاسیس ہوئی تھی۔

"دارالارشاد" کے بارے میں مولانا آزاد نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کے 'البلاغ' میں جو شذرہ لکھا تھا اور "دارالاسلام" کے ضمن میں علامہ اقبال نے جو خط شیخ الازہر علامہ مصطفےٰ المراغی کو تحریر کیا تھا۔ ان کے اقتباسات اس صفحہ کی پشت پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن سے اس حیرت انگیز مماثلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ان تینوں تجویزوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ پیش نظر مقاصد کے لیے کوئی عملی پیش قدمی نہ "دارالارشاد" کے ذریعے ہو سکی نہ "دارالاسلام" کے۔ ان میں سے مقدم الذکر کے بارے میں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کتنے عرصے قائم رہا اور کب ختم ہوا؟ اور اغلباً اس کے لیے کہیں کوئی اینٹ رکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔ البتہ "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ باقاعدہ قائم ہوا۔ اس کے لیے ایک ٹرسٹ وجود میں آیا اور کچھ عمارات بھی ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے قریب سرنا ریلوے سٹیشن سے متصل منصۂ شہود پر آ گئیں۔ جہاں اگست ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک غیر منقسم ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کا مرکزی دفتر قائم رہا اور اس اعتبار سے یقیناً وہ عمارات ایک اعلیٰ مصرف میں آئیں لیکن ان مقاصد کے لیے براہِ راست کوئی پیش قدمی وہاں بھی نہ ہو سکی، جن کے لیے وہ ادارہ اصلاً قائم ہوا تھا۔

"دارالارشاد کا مقصد"

"چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور "الہلال" نے قرآنِ حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی، جس کے ذریعے فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کی عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقامِ سعی و تعب ہے یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

'دارالارشاد' کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سروسامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرفِ علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ اُمت کا فرض انجام دے سکے۔"

(البلاغ: ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

"دارالاسلام" کا مقصد

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علومِ دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں ہوں اور ان کی رہنمائی کے لیے ہم ایک ایسا معلّم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں مہارتِ تامّہ رکھتا ہو نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی رُوح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اخلاق، سیاسیات اور اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جہاد کر سکیں!"

(بحوالہ "اقبال، دارالاسلام اور مودودی" صفحہ ۸۲)

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ۔۔۔ اور ۔۔۔ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ۔ اور ۔ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ